رسائل و مسائل

چند احادیث کے اشکالات اور ان کی توضیح

سوال - ایک عرصہ سے دو تین چیزیں میرے دماغ پر بوجھ بن رہی ہیں - اس لیے مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے -

(۱) بخاری شریف کی تیسری حدیث میں نزول وحی اور حضور کی کیفیات کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ وحی کی ابتداء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اضطراب طاری ہوگیا تھا دریافت طلب یہ امر ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام گھبرائے کیوں تھے ؟ یہ بات کہ یہ رسالت کی ذمہ داریوں کے احساس کا نتیجہ تھا دل کو مطمئن نہیں کرتی، ورنہ ورقہ کے پاس لے جانے کے کوئی معنی نہیں بنتے لبعض لوگوں کا یہ اشتباہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اس وقت اپنی رسالت کا کماحقہٗ وضوح نہیں ہوا تھا، کچھ بامعنی بات نہیں معلوم ہوتی - اگر یہ صحیح ہے تو جن کے پاس آپ یہ معاملہ لے کر گئے تھے کیا وہ ان کیفیات کے پس منظر کو حضور سے زیادہ جانتے تھے - ورقہ کے یہ الفاظ "ھذا الناموس الذی انزل اللہ علیٰ موسیٰ" اس امر کے مؤید ہیں کہ واقعی حضورؐ پر اپنی رسالت کا کماحقہٗ وضوح نہیں ہوا تھا - اس کے بعد صورتِ حال مزید مخدوش ہو جاتی ہے - صحیح صورتِ حال کیا ہے ؟

(۲) باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ، حدیث نمبر ۱۲۲۶ میں صحابہ کی ارادتمندی اور عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے عروہؓ ذکر کرتے ہیں : فواللہ ما تنخم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نخامۃ الا وقعت فی کف رجل منھم فدلک بھا وجھہ وجلدہ " نخامہ کھنکار کو بھی کہتے ہیں اور جو غلیظ مواد ناک سے نکلتا ہے اس کو بھی - ان میں سے جو بھی ہو بہرحال قابلِ غور ہے - کیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نخامہ کی یہ کیفیت نہیں ہوتی تھی جو عام طور پر ہوتی ہے ؟

یا فرطِ عقیدت کی وجہ سے صحابہ کو اسے چہرے اور جسم پر مل لینے میں اجنبیت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ حضورؐ کی نظافت پسندی اس میں حائل کیوں نہ ہوئی؟

(۳) باب استعمال فضل وضوء الناس حدیث ۱۵۵ میں آتا ہے دعا النبی صلی اللہ علیہ وسلم بقدح فیہ ماءٌ فغسل یدیہ ووجھہٗ فیہ ومجّ فیہ ثم قال لھما اشربا وافرغا علی وجوھکما ونحورکما۔ پانی کے برتن میں ہاتھ دھونا، پھر اس میں کلی کرنا، اور ان سب کے بعد لوگوں سے کہنا کہ اسے پیو اور اس سے منہ دھوؤ۔ یہ سب کچھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نظافت پسندی کے عام کلیہ کے مخالف معلوم ہوتا ہے پھر صحابہ کا اس سلسلہ میں بے خود ہو کر اس کو استعمال کرنا اور بھی عجیب معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت مطلوب ہے۔

اقبال اور حدیث

(۴) اقبال مرحوم کو پاکستان میں قبولِ عام حاصل ہے۔ بالخصوص جدید طبقہ میں، اور اسی طبقہ میں پرویزی حضرات بھی گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ اس لیے یہ لوگ یہ مشہور کر رہے ہیں کہ اقبال بھی منکرِ حدیث تھا۔ صحیح صورتِ حال کیا ہے؟ انگریزی خطبات میں مرحوم نے جن مآخذ کا ذکر کیا ہے، ان میں حدیث کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کی تفصیل اور توضیح میں جن نکات کا مرحوم نے ذکر کیا ہے ان سے مرحوم کا اپنا نظریہ منکرینِ حدیث کی حوصلہ افزائی کا موجب سا بن گیا ہے۔

جواب: آپ نے جو سوالات کیے ہیں ان کا مختصر جواب حاضرِ خدمت ہے۔

(۱) نزولِ وحی کی کیفیت کو ٹھیک سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اچانک اس صورتِ حال سے سابقہ پیش آیا تھا۔ آپ کو اس سے پہلے کبھی یہ گمان بھی نہ گزرا تھا کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ نہ اس کی کوئی خواہش آپ کے دل کے کسی گوشے میں موجود تھی۔ نہ اس کے لیے آپ پہلے سے کوئی تیاری کر رہے تھے اور اس کے متوقع تھے کہ ایک فرشتہ اوپر سے پیغام لے کر آئے گا۔ آپ خلوت میں بیٹھ بیٹھ کر مراقبہ

اور عبادت ضرور فرماتے تھے لیکن نبی بنائے جانے کا کوئی تصور آپ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا اس حالت میں جب یکایک غارِ حرا کی اس تنہائی میں فرشتہ آیا تو آپ کے اوپر فطرۃً اس پہلے عظیم اور غیر معمولی تجربے سے وہی گھبراہٹ طاری ہوئی جو لامحالہ ایک بشر پر طاری ہونی ہی چاہیئے قطع نظر اس سے کہ وہ کیسا ہی عظیم الشان بشر ہو۔ یہ گھبراہٹ بسیط نہیں بلکہ مرکب نوعیت کی تھی۔ طرح طرح کے سوالات حضور کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے جنہوں نے طبع مبارک کو سخت خلجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ کیا واقعی میں نبی ہی بنایا گیا ہوں؟ کہیں مجھے کسی سخت آزمائش میں تو نہیں ڈال دیا گیا ہے؟ یہ بارِ عظیم آخر میں کیسے اٹھاؤں گا؟ لوگوں سے کیسے کہوں کہ میں تمہاری طرف نبی مقرر ہوا ہوں؟ لوگ میری بات کیسے مان لیں گے؟ آج تک جس معاشرے میں عزت کے ساتھ رہا ہوں، اب لوگ میرا مذاق اڑائیں گے اور مجھے دیوانہ کہیں گے۔ اس جاہلیت کے ماحول سے آخر میں کیسے لڑ سکوں گا؟ غرض اس طرح کے نہ معلوم کتنے سوالات ہونگے جو آپ کو پریشان کر رہے ہوں گے۔ اسی وجہ سے جب آپ گھر پہنچے تو کانپ رہے تھے۔ جاتے ہی فرمایا کہ مجھے اڑھا دو، مجھے اڑھا دو۔ گھر والوں نے آپ کو اڑھا دیا۔ کچھ دیر کے بعد جب ذرا دل ٹھیرا تو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سارا واقعہ سنایا اور فرمایا لَقَدْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ "مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے"۔ انہوں نے آپ کو اطمینان دلایا کہ کلا واللہ ما یحزنك الله ابدا۔ انك لتصل الرحم وتحمل الكل وتكسب المعدوم وتقري الضيف وتعين على نوائب الحق "ہرگز نہیں، خدا کی قسم آپ کو اللہ کبھی رنج نہ دیگا۔ آپ تو رشتہ داروں کے کام آتے ہیں بیکسوں کی مدد کرتے ہیں۔ نادار کی دستگیری کرتے ہیں، مہمان کی تواضع کرتے ہیں اور تمام نیک کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں"۔ پھر وہ ورقہ بن نوفل کے پاس آپ کو لے گئیں، کیونکہ وہ اہل کتاب میں سے تھے اور انبیائے سابقین کے حالات سے باخبر تھے۔ انہوں نے حضور سے کیفیت سن کر بلاتامل تصدیق کی کہ "یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ پر آیا تھا"۔ اس لیے کہ وہ بچپن سے لیکر جوانی تک آپ کی انتہائی پاکیزہ سیرت سے خوب واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ یہاں

پہلے سے نبوت کے دعوے کی کسی تیاری کا شائبہ تک نہیں پایا گیا ہے۔ ان دونوں باتوں کو جب انہوں نے اس واقعہ سے ملایا کہ یکایک غیب سے ایک ہستی آ کر ایسے شخص کو ان حالات میں وہ پیغام دیتی ہے جو عین تعلیماتِ انبیاء کے مطابق ہے تو یہ ضرور سچی نبوّت ہے۔

یہ سارا قصہ ایسا فطری اور معقول ہے کہ اس صورتِ حال میں یہی کچھ ہونا چاہیے تھا۔ اس پر شکوک کا پیدا ہونا تو درکنار، میرے نزدیک تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی صادق ہونے کے اہم ترین دلائل میں سے ایک ہے۔ اگر یہ معاملہ اس طرح پیش نہ آتا اور آپ یکایک حرا سے آتے ہی بڑے اطمینان کے ساتھ فرشتے کی آمد کا واقعہ مجمع عام میں سنا کر اپنی نبوت کا دعویٰ پیش فرماتے تو ایک آدمی یہ شک کر سکتا تھا کہ حضرت پہلے سے اپنے آپ کو نبوت کا اہل سمجھے بیٹھے تھے اور دور ایک غار میں بیٹھ بیٹھ کر اس کا انتظار کر رہے تھے کہ کب کوئی کشف و الہام ہوتا ہے۔ آخر شدتِ مراقبہ نے ذہن کے سامنے ایک فرشتے کا نقشہ پیش کر ہی دیا اور کانوں میں آوازیں بھی آنے لگیں، معاذ اللہ۔ لیکن خدا کے فضل سے وہاں نبوت کا ارادہ اور اس کی خواہش اور کوشش تو درکنار، جب بالفعل وہ مل گئی تب بھی چند ساعتوں تک عالم حیرت ہی طاری رہا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ بے نظیر شخصیت کے مالک ہونے پر بھی وہ ذات عجب و خود پسندی سے اس درجہ خالی تھی کہ جب نبوت کے منصب عظیم پر یکایک مامور کر دیئے گئے اس وقت بھی کافی دیر تک یہ اطمینان نہ ہوتا تھا کہ دنیا کے کروڑوں انسانوں میں سے تنہا ایک میں ہی اس قابل ہوں کہ اس منصب کے لیے ربّ کائنات کی نگاہِ انتخاب میرے اوپر پڑے۔

(۲) دوسرے نمبر پر آپ نے جس واقعہ پر تعجب کا اظہار کیا ہے، وہ درحقیقت کسی تعجب کا محل نہیں ہے۔ بس ذرا اس امر پر غور کر لیجیے کہ معاملہ ایک نبیؐ کا ہے اور ان لوگوں کا ہے جو سچے دل سے مان چکے تھے کہ حضور نبی ہیں اور اپنے درمیان اس عظیم المرتبت ہستی کو موجود پا رہے تھے۔ اس مرتبے کی ہستیوں کا جو زبردست اثر ان لوگوں پر ہو سکتا ہے جنہیں یقین ہو کہ ہمارے سامنے وہ شخص موجود ہے جسے اللہ سے مکالمہ کا شرف حاصل ہوتا ہے، اس کا اندازہ

آپ بخوبی کر سکتے ہیں اگر تھوڑی دیر کے لیے خود اپنے آپ کو ان لوگوں کی جگہ فرض کریں۔ یہ انبیاء کا غیر معمولی اثر ہی تو تھا جس کی بدولت ان کے معتقدین میں سے بکثرت لوگ حد پہ نہ رک سکے اور غلو کر کے انہیں خدا اور ابن اللہ اور اوتار اور نہ معلوم کیا کیا بنا بیٹھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں لوگوں کو حد اعتدال پہ قائم رکھنے کے لیے جو کوششیں فرمائیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ مگر اس کے ساتھ آپ نے انسانی فطرت کی رعایت بھی ملحوظ رکھی اور حدِ اعتدال کے اندر جہاں تک شدتِ عقیدت کو جانے کی اجازت دی جا سکتی تھی وہاں تک جانے سے لوگوں کو نہیں روکا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت لوگوں نے حضور کا تھوک زمین پر نہ گرنے دیا اور آگے بڑھ کر اسے ہاتھوں پر لینے اور اپنے منہ اور جسم پر مل لینے کی کوشش کی تو آپ نے منع نہ فرمایا۔ رہی یہ بات کہ خود لوگوں کو گھن کیوں نہ آتی تھی، تو میں کہوں گا کہ عام انسانوں کے تھوک سے تو ضرور گھن آسکتی ہے، مگر جس منہ پر خدا کا کلام اترتا ہو اس کے تھوک سے گھن آنا تو درکنار، اہلِ ایمان کی نگاہ میں تو عطر کی بھی اس کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔

(۳) تیسرے واقعہ کی نوعیت بھی وہی ہے جو اوپر کے واقعہ کی ہے۔ لیکن اس کی پوری تفصیل جو بخاری کتاب المغازی، باب غزوۃ الطائف میں آئی ہے، اگر نگاہ میں رہے تو وہ بات زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے جو اوپر میں نے بیان کی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ حضورؐ نے غزوۂ حنین کے غنائم برسرِ موقع تقسیم کرنے کے بجائے جعرانہ پہنچ کر تقسیم کرنے کا فیصلہ فرمایا تھا اور اس کی وجہ سے بعض نئے نئے ایمان لاتے ہوئے لوگ بڑے بے صبر ہو رہے تھے۔ جب آپ جعرانہ پہنچے تو ایک بدو نے آکر اپنے حصّے کا مطالبہ کیا۔ حضورؐ نے فرمایا "تجھے بشارت ہو" (یعنی اس بات کی بشارت کہ عنقریب حصّے تقسیم ہوں گے اور اب تک جو تو نے صبر کیا اس کا اجر ملیگا)۔ اس نے ترخ کر کہا "آپ کی یہ بشارتیں میں بہت سُن چکا ہوں"۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت بلالؓ اس وقت حاضر تھے۔ حضورؐ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا "اس نے میری بشارت رد کر دی۔ تم دونوں اسے قبول کر و"۔ دونوں نے عرض کیا "ہم نے قبول کی"۔ پھر

آپ نے ایک پیالہ بھر پانی منگایا۔ اس میں ہاتھ اور منہ دھویا اور کلی کی پھر دونوں صاحبوں سے فرمایا تم اسے پی لو اور اپنے منہ اور سینے پر ڈالو اور بشارت لو۔ چنانچہ دونوں نے ایسا ہی کیا پردے کے پیچھے ام المومنین حضرت ام سلمہؓ بیٹھی تھیں۔ انہوں نے پکار کر دونوں صاحبوں سے کہا کچھ اپنی ماں کے لیے بھی بچا لینا۔ یہ سن کر انہوں نے تھوڑا سا پانی بچا لیا اور انہیں بھی دیا۔

اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور دراصل اس بدو کو یہ سبق دینا چاہتے تھے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود اس نے جو اس بے بہا بشارت کو رد کیا ہے، یہ کیسی ناشکری اور بدبختی ہے، اور سچے اہل ایمان کا اپنے نبی کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت کا انداز اور پھر ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا اس پانی میں سے اپنا حصہ طلب کرنا صاف بتاتا ہے کہ یہ حضرات اس مبارک پانی کو لے کر پینے اور منہ اور سینہ پر ملنے میں کراہت محسوس کرنا تو درکنار اسے اپنے لیے آبِ حیات سمجھتے تھے، اس کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ کر مسابقت کرتے تھے اور انہیں فخر تھا کہ یہ نعمت انہیں نصیب ہوئی۔

(۴) "اقبال اور حدیث" والے سوال کے بارے میں میں صرف اتنا ہی کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے اس مسئلے کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں ہے کہ حدیث کے متعلق اقبال مرحوم کا نظریہ کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ اگر ہمارے پاس اس معاملہ میں صاف اور واضح نصوص اور خلفاء راشدین سے لے کر آج تک کے تمام علمائے امت کا متفقہ طرزِ عمل نہ ہوتا تو شاید ہم اس کے محتاج ہوتے کہ حدیث کے متعلق علامہ اقبالؒ کا نظریہ معلوم کرتے۔ لیکن ان حجتوں کی موجودگی میں یہ چیز تلاش کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

اسلام اور طبی تعلیم و تربیت

سوال: میں میڈیکل کالج کا طالب علم ہوں۔ ایک اہم مسئلہ میں آپ کی رائے درکار ہے۔